© rasailojaraid.com

# قائداعظم، علی گڑھ تحریک اور بلوچستان

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

پاک و ہند میں انگریزوں[1] کی حکمرانی کے خلاف جس ردعمل کا اظہار ہوا اور مسلح مقابلہ کیا گیا، اس کی قیادت شہزادوں نے کی۔ مگر یہ آزادی پسند شہزادے اپنی افواج، ساز و سامان، غیر ملکی مشوروں اور ذریعوں کے ساتھ انگریزوں کی پیش قدمی کو روک نہ سکے۔ انگریز ایک صوبے کے بعد دوسرے صوبے کو اپنی حکومت میں شامل کرتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ ۱۸۴۹ء میں پنجاب بھی ان کے قبضۂ اقتدار میں آ گیا۔ بعد ازاں صرف ۱۸۵۷ء میں ہمارے شہزادوں، مدبروں، سپاہیوں، زمینداروں، عالموں اور کسانوں میں بیداری کی لہر دوڑی اور وہ انگریزی راج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے مگر یہ بیداری بعد از وقت تھی۔ ہمارے اخلاقی اقدار، ہمارا تمدنی ورثہ اور ہزاروں خاندان تباہ ہو گئے۔ مسلمانوں کو اس المیے میں خاصا نقصان اٹھانا پڑا اور یاسیت کا دور دورہ ہوا۔

ان گھمبیر حالات میں سرسید احمد خان نے جن کے بارے میں کسی نے درست کہا[2] ہے کہ ''وہ ایک فرد نہیں، ایک ادارہ نہیں بلکہ کئی اداروں کا مجموعہ اور اپنی ذات میں ایک نہیں کئی تحریکوں کا منبع تھے''، وہ نظریہ پیش کیا جو زندگی اور قوت دونوں کے لیے تازگی اور افزائش کا باعث تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان ان علوم سے بہرہ مند ہوں جن کے بغیر انگریزی نظم و نسق میں حصہ لینا ممکن ہی نہ تھا اور ان ہم وطنوں کے غلبہ سے بچنے کی کوئی سبیل نہ تھی جو انگریزوں کے اقتدار کے ساتھ ہی ان کے علوم سیکھ کر حکومت میں شریک ہو گئے تھے۔ بعد ازاں ردعمل کی دو صورتیں ابھریں ایک مشترکہ جدوجہد دوسری الگ الگ کوششیں۔ انگریزوں کے خلاف ہماری مجاہدانہ سرگرمیاں انہی دو صورتوں میں ظہور پذیر ہوئیں۔

انگریزوں کے آخری مفتوحہ علاقوں میں سے ایک بلوچستان تھا جس پر وہ ۲۱ فروری ۱۸۷۷ء کو قابض ہوئے اور یہ متذکرہ بالا ردعمل سے مستثنیٰ نہ تھا۔ بلوچستانی کئی بار انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوئے[3] جیسے:

اولاً: میر محراب خان آف قلات کے زیر سرکردگی پہلی افغان جنگ کے بعد ۱۸۳۹ء میں۔

ثانیاً: غلام حسین سوری بگٹی کے تحت۔ وہ انگریزوں کے مقابلے پر تیرہ سو مسلح آدمیوں کو لایا اور ۲۶ جنوری ۱۸۶۷ء کو اپنے دو سو ستاون ساتھیوں کے ساتھ شہید ہوا۔

ثالثاً: شاہجہاں جوگیزئی نے انگریزوں کے ساتھ کئی لڑائیاں لڑیں۔ جن میں بغاؤ اور کچھ کی لڑائیاں بہت مشہور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہیں۔

ان جنگوں نے بلوچستانیوں پر عیاں کر دیا کہ انگریزوں کے خلاف ایسی جنگیں لاحاصل اور گراں ہیں۔ اس لیے دوسرے ردّعمل کی پیروی کی گئی۔ چنانچہ دوسرے ردّعمل کی رہنمائی[۴] یوسف علی خاں عزیز مگسی (۱۹۰۸ء۔۱۹۳۵ء) نے کی جو سرسید کے خیالات اور ان کی اصلاحات، علامہ اقبال،[۵] مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریرات اور سیاسی نظریات سے اثر پذیر ہوئے تھے۔

یوسف عزیز بلوچستان میں سیاسی بیداری کے علم بردار اور قائد تھے۔ آپ کے متعلق مولانا ظفر علی خاں نے کہا تھا:

لفظ بلوچ مہر و وفا کا کلام ہے
معنی ہیں اس کلام کے یوسف علی عزیز

یوسف عزیز نے مسلمانوں بالخصوص بلوچستان کے مسائل کے مختلف سماجی، سیاسی اور معاشی پہلوؤں کا مطالعہ کیا اور اپنی زندگی ان کو سلجھانے کے لیے وقف کر دی، یہاں تک کہ آپ مختلف بلوچ قبیلوں اور سرمایہ داروں کو یکجا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ آپ ہی کی تجویز پر پہلی ''کل ہند بلوچ کانفرنس'' ۲۷، ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۳۲ء کو جیکب آباد میں منعقد ہوئی۔

بلوچستان کے صف اول کے صحافی، نامور قلمکار اور دانشور عبدالصمد درانی اپنے مضمون ''ہماری جدوجہد کا ایک باب''[۶] میں لکھتے ہیں:

> بلوچ کانفرنس کی تجویز نے سب سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جنم لیا، جہاں مرحوم نواب یوسف علی خاں اپنے دیرینہ رفیق میر محمد امین خاں کھوسہ سے ملنے گئے تھے۔ محمد امین خاں ان دنوں یونیورسٹی کی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ علی گڑھ کے اس تصور نے سندھ اور بلوچستان کے مقام اتصال یعنی خان گڑھ (جیکب آباد) میں عملی جامہ پہنا۔

یوسف عزیز نے اہل بلوچستان کو ابھارنے کے لیے مختلف[۷] طریقے اختیار کیے۔ کراچی سے مختلف اخبارات (البلوچ، بلوچستان، بلوچستان جدید اور ینگ بلوچستان) جاری کرائے، جو یکے بعد دیگرے ضبط ہوتے رہے۔ انہوں نے احباب کو اردو میں بیشمار خطوط[۸] تحریر کیے۔ جو نہ صرف ان کی اپنی شخصیت کا آئینہ دار ہیں بلکہ مسلمانوں کے بارے میں اسلامی تقاضوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کے سماجی فلسفے کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ان کے خیالات کے مطابق اسلام کا سماجی فلسفہ یہ تھا کہ انفرادی مفاد اجتماعی مفاد کے تابع ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



۱۹۳۳ء سے پہلے علاقہ جھل مگسی میں تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ صرف چند آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے، جو قاضی جھل سے صرف فارسی پڑھے ہوئے ہوتے تھے۔ جب سردار محمد یوسف علی خاں، قوم مگسی کے سردار ہوئے تو علاقے کی تعلیمی پستی کو محسوس کرتے ہوئے ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جھل مگسی میں علی گڑھ کی طرز پر ''جامعۂ یوسف عزیزی'' کا سنگ بنیاد[9] رکھا گیا۔ اس جامعہ کے لیے آپ نے اس زمانے میں پچاس ہزار روپے کا ذاتی عطیہ دیا۔ آپ نے کوٹ یوسف علی خاں کے نام سے ایک قصبے کی بنیاد ڈالی اور وہاں سکول قائم کیا۔ پنجک میں بھی پرائمری سکول جاری کیا۔ جھل مگسی میں غریب اور نادار بچوں کے لیے دارالاقامہ قائم ہوا، جہاں قیام اور خوراک کا انتظام جامعہ کی طرف سے تھا۔ پانچ سے نو سال کی عمر تک کے بچوں کے لیے جبری تعلیم کا حکم جاری کیا اور آمدنی کا دسواں حصہ تعلیم پر خرچ کرنے کا فیلہ کر لیا گیا۔ علاقے کی تعلیم کے انتظام کے لیے ایک علیحدہ افسر مقرر ہوا جسے ''ناظم جامعہ یوسفیہ جھل'' کہتے تھے۔

یوسف عزیز بذات خود جامعہ میں معائنے کے لیے جاتے، تعلیمی حالت کا جائزہ لیتے اور رائے بک میں عملی ترقی اور عام معیار کی بلندی کے لیے تجاویز قلمبند فرماتے۔ مزید تفصیلات کے لیے (جیسے تعلیم کا مقصد، نصاب تعلیم، اساتذہ کے فرائض، طلباء کی تعلیم و تربیت وغیرہ) کے لیے راقم الحروف (انعام الحق کوثر) کی کتاب ''بلوچستان میں اردو'' (لاہور، ۱۹۶۸ء، راولپنڈی، ۱۹۶۸ء، ۱۹۹۴ء) ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ جامعہ میں انگریزی، عربی اور فارسی مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں ایک نظم بہ عنوان ''جامعۂ عزیزیہ جھل کے طلبہ سے'' چھپی تھی، جس کے تین شعر یہ ہیں:

عزیزی جامعہ ہے در حقیقت دولت نایاب
کچھ اس کے سامنے سمجھو نہ قاروں کے خزینے کو
کرو صد جانفشانی سے سبق اسلام کے ازبر
اسی توشے کو لے کر چل سکو گے تم مدینے کو
چھپا کب تک رہے گا آہ جھل کے تنگ گوشے میں
سر بازار لاؤ حسنِ ''یوسف'' کے خزینے کو

جہاں ''جامعہ یوسفیہ عزیزیہ'' نے اس پس ماندہ علاقے کے تعلیمی سلسلے میں ایک عام بیداری پیدا کر دی اور تعلیم کو اتنا ہی ضروری سمجھا جانے لگا جتنا کھانے، پینے، نہانے اور دھونے کو تصور کیا جاتا تھا، وہاں اس جامعہ نے اردو زبان و ادب کی اشاعت میں بھی اپنا حق ادا کیا۔ نواب یوسف علی خاں عزیز مگسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



نے جہاں اپنی دوسری گوناگوں صلاحیتوں کو قومی بیداری و ترقی کے لیے وقف کر رکھا تھا وہاں انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیت کو بھی اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے استعمال کیا۔ چنانچہ انتظار حسین کا یہ کہنا برمحل ہے کہ یوسف علی عزیز کی شاعری کے ذریعے ہم بلوچستان کے سیاسی شعور کا اس وقت کے ہندوستان کے اس بھرپور سیاسی شعور سے رشتہ پیوست ہوتے دیکھتے ہیں، جس کا اردو میں علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں اور دوسرے ان گنت چھوٹے بڑے شاعروں کے واسطے سے اظہار ہو رہا تھا اور جس کی بناء پر اردو ہندوستان کی تحریک آزادی کی اور آگے چل کر تحریک پاکستان کی زبان بن گئی۔

یوسف عزیز کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

یہ ارادہ ہے کہ اسلام کا خادم بن کر ساری دنیا کو نئے سر سے مسلماں کر دوں
پھر وہی بھولا سبق یاد دلاؤں سب کو ہر بلوچی کو غرض عامل قرآں کر دوں
گاندھی و مالوی کے وعظ دھرے رہ جائیں میں اگر قوم محمد ﷺ کو نمایاں کر دوں
قسم ہے امی بطحا کے ایثار و شجاعت کی شکم پر سنگ خارا باندھنے والی سخاوت کی
کہ اپنے ملک سے داغ غلامی دھو کے چھوڑوں گا
بلوچستان کو آزادی کی مے پلوا کے چھوڑوں گا

کٹا کر چند سر اور گردنیں اپنے رفیقوں کی
زکواۃ فرض اپنی قوم سے دلوا کے چھوڑوں گا

میں پھر انداز نو سے نغمۂ حب وطن گا کر
سکوت اندوز تار اسلام کا بجوا کر چھوڑوں گا

وہ زیب عرب، وہ فخر عجم روتا ہے تمہاری غفلت پر
اٹھ تھام لے باگیں دنیا کی، غازی کہلا، اٹھ ہمت کر
ہے وقت عجب امت پہ پڑا، تاخیر کے معنی موت کے ہیں
تاخیر نہ کر، تعجیل سے اٹھ، ایمان سے اٹھ، اٹھ ہمت کر
تو مورث ابراہیم کا ہے، پھر آزر کی تقلید ہے کیوں
بت توڑ، خدا سے جوڑ کہ تو ہے عبد خدا، اٹھ ہمت کر
تو فرزند توحید ہے گر، تو حید پہ کٹ، توحید پہ مر
سرمایہ ترا، سامان ترا، ہے ذات خدا، اٹھ ہمت کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



یوسف عزیز نے کھیرتر نہر بنوائی جس سے سندھ کی سرحد کے قریب علاقہ مگسی کا خاصا رقبہ سیراب ہوا۔ مزید برآں غریبوں کے لیے شفا خانہ قائم کیا گیا۔ یوسف عزیز فیاض طبع اور روشن خیال تھے جو مطلق العنان ہونے کے باوجود اپنے لوگوں کی بہتری کے لیے رات دن ان تھک کام کرتے تھے۔ ان کے دروازے ہمیشہ عیش وعشرت، سستی اور سرکاری آداب کے لیے بند تھے، لیکن عام انسانوں کے لیے ہمیشہ کھلے تھے۔ جنھیں آپ اپنے مہمان اور مقدس امانت سمجھتے تھے۔ وہ قوم کو ارفع ترین عظمت پر اٹھا دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے مضمون ''بلوچستان کی بیداری اور سرمایہ داروں میں سراسیمگی'' میں تحریر فرماتے ہیں:

> نیشنلزم، بلکہ اس سے بھی اعلیٰ و ارفع تخیل یعنی حقیقی اسلام ازم (جس کی وسعت میں قومی، وطنی، نسلی اور لسانی معتقدات سب کے سب خواب پریشان ہو کر رہ جاتے ہیں اور جس کا معیار انسانیت کامل کا حصول اور نوع انسان میں اتحاد و یگانگت کی روح پھیلانا ہے) کی دلوں سے محو شدہ یاد کو پھر سے دہرانے کے لیے ایک جماعت حق کا پیشوا ہونا اور اپنے ہم مذہب وطنی رہنمایان قوم کی مخالفت اور حکومت کی شکوک افزا روش کے باوجود شراب عشق سے مست موانع و ممالک سے بے نیاز اپنے مسلک پر ثابت اور صراط مستقیم پر چلا جانا اگر کوئی دلفریب حقیقت رکھتے ہیں تو میں مستقبل کے لیے پرامید ہوں کہ انشاء اللہ یہ سہرا بلوچوں کے ہی سر پر ہوگا:
>
> *عام بیداری کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے*
> *اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ*

**میزان** کوئٹہ میں مندرج ہے: ''آپ فروری ۱۹۳۴ء میں قومی تحریک آزادی کے سلسلے میں انگلستان تشریف لے گئے تھے جبکہ سر نارمن کیٹر جیسا قدامت پسند انگریز بلوچستان میں اے جی جی تھا۔ بمبئی مالا بار ہل میں حضرت قائداعظم کی خدمت میں مرحوم یوسف کئی بار حاضر ہوئے اور انگلستان سے واپس آ کر ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء کے دن بھی مرحوم نواب یوسف علی خاں قائداعظم سے ملے''۔

لندن سے واپسی پر آپ نے ''سیاسیات مقدم ہے یا اقتصادیات'' کے عنوان سے ایک زوردار مضمون لکھا جس میں اپنے خیالات اس طرح پیش کیے: ''وہ اشخاص جو دو وقت کی روٹی پیٹ بھر کر کھانے کی استطاعت رکھتے ہیں،، کیا انگلیوں پر نہیں گنے جا سکتے؟ ہمارے دیہات کی منتشر آبادی، جن کو نہ سونے کا ڈھنگ ہے، نہ کھانے کی تمیز اور پھر سردار پرستی، بیماریوں سے بھرے ہوئے غلیظ گھروں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



سال ہا سال کے پرانے کپڑوں کا، جو جراثیم کا آشیاں بنے ہوئے ہیں، استعمال دردناک نہیں؟''

اس موقعہ پر آپ ''مدرستہ البنات'' کوئٹہ میں بھی تشریف لے گئے تھے اس مدرسہ کے مہتمم مولانا عبیداللہ خاں بلوچ کو آپ سے والہانہ انس تھا۔ اس مدرسے کی بچیوں نے مولانا ظفرعلی خاں مرحوم کے ان اشعار سے یوسف عزیز کا خیر مقدم کیا:

مبارک ہو یوسف علی خاں کی آمد
گلستاں میں فصل بہاراں کی آمد
گل ولالہ وارغواں کو مبارک
برستے ہوئے ابر نیساں کی آمد

لندن سے واپسی پر آپ حسب سابق پھر قومی سرگرمیوں میں منہمک ہو گئے مگر افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی اور آپ ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کی رات کوئٹہ کے خوفناک زلزلے کا شکار ہو گئے:

عزیز موت کا جب ایک دن معین ہے
مجاہدوں میں کبرائیں نہ کیوں شمار اپنا

بلوچستان میں انگریزوں کی آمد اور ان کے قبضے کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ انہوں نے سوچا کہ بلوچستان کے خانہ بدوش اور خانہ نشین لوگ برصغیر سے اتنے کٹے ہوئے ہیں اور پسماندہ ہیں کہ وہ جلد ہی عیسائیت کے جال میں پھنس جائیں گے۔ چنانچہ عیسائی مبلغین کی مسلسل [10] یلغار ہوئی۔ یہی انگریزوں کی یلغار کا دوسرا دور تھا۔ پہلے دور میں ۱۸۳۹ء بمطابق ۱۲۵۵ھ سے سابقہ ریاست قلات میں انگریز سامراج کا عمل دخل، تہذیب وتمدن اور عقیدے کے اعتبار سے ہر شعبہ حیات میں اپنی کارستانی دکھانے لگا تھا۔ دوسرے دور کی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے علامہ محمد فاضل درخانی (۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء؛ ۱۹ شوال ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء) آگے بڑھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت انہیں انگریزوں کے فکری و اعتقادی حملوں کے خلاف مسلح کرنا چاہتی تھی۔ وہ سندھ کی اسلامی درسگاہوں سے فیض یاب ہو کر اپنے گاؤں درخاں نزد ڈھاڈر آئے اور وہاں درس و تدریس اور تحریر و تقریر کے لیے نہ صرف ایک طویل سلسلے کا آغاز کیا بلکہ ایک ایسا گروہ پیدا کیا جس نے عیسائی مبلغین کے لٹریچر اور دلائل و براہین کو بے اثر بنا کر رکھ دیا۔ علامہ محمد عمر دین پوری کا براہوئی میں قرآن حکیم کا ترجمہ ۱۳۳۴ھ بمطابق 1915ء میں طبع ہوا۔ میاں حضور بخش جتوئی نے قرآن مجید کا ترجمہ بلوچی میں کیا جو ابھی تک متداول ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



جس طرح سرسید کے ''تہذیب الاخلاق'' اور مولانا الطاف حسین حالی کی ''مسدس'' نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو بری رسوم سے آگاہ کر کے ان کو ترک کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ اسی طرح بلوچستان میں وہی انداز مولانا نبو جان نے اپنایا۔ ان کے ''نصیحت نامہ'' نے لوگوں کو بیدار کر کے دینِ مصطفیٰ علیہ السلام کی صحیح تبلیغ کی۔ اسی دور میں عیسائی مبلغین بروہی علاقوں میں مصروف عمل ہو گئے۔ ان کا ایک قائد ریورینڈ ٹی۔ جے۔ ایل میئر تھا۔ جو برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی سے متعلق تھا۔ وہ سالہا سال تک بروہیوں سے آزادانہ گھلا ملا رہا اور پھر اس نے تین حصوں میں ''اے براہوئی ریڈنگ بک'' رومن حروف میں لکھی جس کے ہر حصے کے آخری صفحہ پر جو عبارت مرقوم ہے اس کا اردو ترجمہ یہ ہے: ''یہ کتاب حضرت عیسیٰ کے ان پیروؤں کے نام منسوب ہے جن کو یہ عظیم سعادت نصیب ہو سکتی ہے کہ وہ مستقبل قریب میں بروہی لوگوں کو عیسائی بنالیں''۔

عیسائی مشنریوں نے انجیل کا براہوئی ترجمہ بھی شائع کیا۔ میئر اور اس کے رفقائے کار کا نظریہ یہ تھا کہ بروہی عوام سے براہ راست گھل مل کر انہیں زر و جواہرات اور اختیار و اقتدار کا چسکا ڈال کر عیسائی تعلیمات کا قائل و عامل کروا دیا جائے تا کہ غیر ملکی انگریزی حکومت اور بروہی عوام میں کوئی فاصلہ ہی نہ رہے اور کسی مدافعت و مخالفت کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔

ان حالات میں شیخ البلوچستان علامہ محمد فاضل درخانیؒ اور ان کے نامور تلامذہ نے جس جوش و جذبے اور عقل و شعور سے کام کیا اس کے نتیجے میں ایک بلوچستانی بھی عیسائیت کے جال میں گرفتار نہ ہو سکا۔ اس گروہ میں علامہ محمد عمر دین پوری (المتوفی ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۸ء) کا نام نامی سرفہرست تھا۔ جو پچاس کے لگ بھگ کتابوں کے مصنف تھے۔ شیخ البلوچستان علامہ محمد فاضل درخانیؒ کے جانشین ان کے نواسے مولانا محمد عبداللہ درخانی نقشبندی مجددی (۱۱ محرم ۱۲۹۸ھ/۱۸۷۸ء۔ ۱۱ صفر المظفر ۱۳۶۳ھ/ بمطابق ۶ فروری ۱۹۴۴ء۔ آپ نے قطب عصر حضرات خواجہ محمد عمر چشموی (۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء۔ ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔ آپ اپنے تبحر علمی کے باعث ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء سے ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء تک سابقہ ریاست قلات کے قاضی القضاۃ رہے) ہوئے اور ادارہ مطبوعات، مسجد اور لنگر وغیرہ کا انتظام سنبھالا۔ آپ متعدد کتب کے مصنف تھے۔ فتویٰ درخانی (دو جلدیں) اب تک غیر مطبوعہ ہے۔

اس علمی اور ذہنی جہاد کے پہلو بہ پہلو سیاسی تحریک کی بھی ابتدا ہوئی۔ سرسید نے مسلمانوں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



بہتری کے لیے جو تحریک جاری کی تھی اس نے مختلف علاقوں کو متاثر کیا۔

کوئٹہ میں 'انجمن اسلامیہ' بلوچستان ۱۸۸۶ء [11] میں قائم ہوئی۔ اس کا ابتدائی نام تھا: انجمن اسلامیہ حنفیہ اہل پنجاب و ہند بلوچستان۔ یہ کوئٹہ میں سب سے پہلی ثقافتی و مجلسی و بہبود کی انجمن ہے۔ جس کا اولین مقصد اہل بلوچستان کے مسلمان طلباء کو دینی و دنیاوی تعلیم سے آراستہ کرنا، مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنا، مذہبی تہواروں کو جوش و خروش سے منانا اور بلوچستان میں مسجدوں اور عیدگاہوں کی خدمت کرنا تھا۔

انجمن اسلامیہ بلوچستان کے زیر سرپرستی اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ قریباً سو سال سے خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس ادارے سے مسلمان طلبہ زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد پاکستان کے علاوہ دنیا کے کونے کونے میں پھیل چکے ہیں۔

اسی اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ کو قائداعظم نے ۱۸ جولائی ۱۹۴۳ء کو ''چھوٹا علی گڑھ'' کہا تھا اور یہیں مسلمانوں کے جلسوں سے خطاب کیا تھا۔ آج یہ ''چھوٹا علی گڑھ'' اپنے علاوہ چار اور اعلیٰ معیار کے تعلیمی اداروں کو جن میں ایک گرلز کالج بھی ہے قائم کیے ہوئے ہے۔ انجمن اسلامیہ بلوچستان کوئٹہ کے قیام کے زمانے میں یہاں نہ تو کوئی سیاسی جماعت تھی اور نہ ہی کسی سیاسی جماعت کا وجود برداشت کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی سیاسی تربیت اور اخلاقی سدھار کے فرائض بھی ''انجمن اسلامیہ'' ہی بجا لاتی تھی۔ سال میں دو مرتبہ انجمن کے عام جلسے ہوتے تھے۔ ایک یوم تاسیس پر اور دوسرا میلاد النبی ﷺ کے موقع پر۔ یوم تاسیس پر سکول کا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوتا تھا۔ یہ تقریب بڑے پرشکوہ طریقے پر منائی جاتی تھی۔ میلاد النبی کے جلسے بطریق احسن اور یادگاری نوعیت کے حامل کئی کئی روز تک ہوتے تھے اور ملک کے جید علماء ان جلسوں سے خطاب کرتے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں نواب بہادر یار جنگ نے بھی ایک جلسہ سے خطاب فرمایا تھا۔ وہ حاضرین کے ذہن و جذبات پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیتے تھے۔ جب چاہتے انہیں رلا دیتے اور جب چاہتے انہیں ہنسا دیتے۔

عیدین کے موقع پر میکموہن پارک میں انجمن اسلامیہ کے زیر انتظام میلے کا اہتمام کیا جاتا تھا اور سکول کے لیے عام مسلمانوں سے چندہ لیا جاتا تھا۔ اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ کے طلباء نے بلوچستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو ہر اعتبار سے کامیاب کرایا اور بلوچستان سٹوڈنٹس فیڈریشن نے بلوچستان میں مسلم لیگ کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مسلم لیگ کے جلسوں کو کامیاب بنانا، مسلم زعماء کا استقبال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کرنا، جلوسوں کو پر رونق بنانا، اس فیڈ ریشن اور طلبہ اسلامیہ ہائی سکول کا کام تھا۔ اس درسگاہ کے ایک نامور استاد چودھری محمود الحسن نے تحریک پاکستان کے نوجوانوں کی تربیت احسن انداز سے کی تھی۔ بلوچستان مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈر انجمن اسلامیہ بلوچستان کے کارکن اور عہدیدار بھی تھے۔ نواب محمد خان جوگیزئی، میر جعفر خان جمالی، قاضی محمد عیسیٰ خان، خان عبدالغفور خان درّانی، سیٹھ محمد اعظم، اور ملک جان محمد کاسی کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

## آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس اور بلوچستان:

۱۹۴۰ء میں آل انڈیا[12] ایجوکیشنل کانفرنس جس کی بنا ۱۸۸۶ء میں سرسید علیہ الرحمتہ نے ڈالی تھی، کے سالانہ اجلاس منعقدہ پونا (انڈیا) کے آخری سیشن میں قائد بلوچستان قاضی محمد عیسیٰ تشریف لے گئے تھے۔ کانفرنس کے سیکرٹری جناب سید الطاف علی بریلوی کے بیان کے مطابق ان کے پاس قائداعظم کا ایک مفصل خط تھا۔ جس کے باعث کانفرنس کے آل انڈیا پلیٹ فارم سے اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ کو ڈگری کالج بنانے کی تجویز کی پرزور تائید کی گئی۔ اس کانفرنس کے موقع پر قاضی محمد عیسیٰ نے رات بھر مشاعرے کی صدارت کی تھی۔

## قاضی محمد عیسیٰ اور علی گڑھ:

۱۹۴۴ء[13] میں قائداعظم نے قاضی محمد عیسیٰ صدر بلوچستان مسلم لیگ وممبر آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی سے کہا کہ علی گڑھ جاؤ اور وہاں کے طلباء سے خطاب کرو۔ قاضی صاحب نے عرض کیا۔ جہاں بھی آپ جانے کا حکم دیں گے جاؤں گا لیکن علی گڑھ ہرگز نہ جاؤں گا۔ ''اس کی وجہ'' جواباً عرض کیا۔ سنتے ہیں وہاں کے طلبہ ہر کسی کا مذاق اڑاتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ میری اردو کیسی ہے۔ میرا بھی وہ ضرور مذاق اڑائیں گے۔ قائداعظم خوب ہنسے اور فرمایا: میری اردو اور تمھاری اردو ایسی ہے جو ہندوستان کے گوشہ گوشہ کے لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کی فکر نہ کرو۔ آخر کار قاضی عیسیٰ علی گڑھ گئے۔ انہیں بہت پسند آیا۔ بعدازاں علی گڑھ کو قاضی عیسیٰ سے اور قاضی عیسیٰ کو علی گڑھ سے عشق ہوگیا اور قاضی موصوف اتنی بار وہاں گئے کہ لوگوں کو گمان ہوا کہ قاضی محمد عیسیٰ کی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی ہے۔

## مولانا ممتاز علی:

بلوچستان میں تحریک پاکستان کے پیش روؤں میں مولانا[14] ممتاز علی مرحوم کا نام بھی ناقابل فراموش ہے۔ آپ قصبہ انبیٹہ ضلع سہارنپور (انڈیا) سے ۱۸۸۵ء میں کوئٹہ تشریف لائے تھے۔ آپ عالم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



دین اور سنڈیمن ہائی سکول کوئٹہ میں السنہ شرقیہ کے مدرس تھے۔اس کے علاوہ آپ نے گھر پر بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔۱۹۳۵ء میں کوئٹہ کے اندوہناک زلزلہ کے بعد وہ فارغ وقت میں تعلیم یافتہ لوگوں کی محفل میں شامل ہوتے اور وہاں خلافت، جنگ طرابلس اور سلطنت عثمانیہ کے بکھرنے کے حالات ایسے دل پذیر انداز میں بیان فرماتے کہ سامعین نہ صرف متاثر ہوتے بلکہ ان کے دلوں میں اسلام کی عظمت راسخ اور قومی آزادی کی لہر دوڑ جاتی۔

انہی ایام میں تعلیم یافتہ افراد حاجی فضل الٰہی مرحوم کے 'دتو ہوٹل'[۱۵]، قندھاری بازار (شارع اقبال) میں جمع ہوتے اور انگریزوں کی طرف سے مامور خفیہ پولیس کے باوجود ''زمیندار'' ''سیاست'' ''احسان'' اور ''انقلاب'' کا مطالعہ کرتے اور قومی معاملات پر تبادلۂ خیالات کا سلسلہ جاری رکھتے۔

مولانا ممتاز علی کے پوتے مسعود احمد انصاری نے ۱۹۴۵ء میں ''علی گڑھ بک سٹال''[۱۶] کے نام سے مشن روڈ پر کتابوں کی ایک دوکان قائم کی اور اس دکان نے شائقین علم کو اردو کی معیاری کتابیں ملک کے کونے کونے سے تلاش کر کے مہیا کیں۔اس دکان پر اخبارات و رسائل بھی آتے تھے۔ڈان کی ایجنسی بھی اسی کے پاس تھی۔مسعود احمد انصاری یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھی بھرپور انداز میں بھی حصہ لیتے رہے۔

بلوچستان کے متعدد طلباء نے علی گڑھ جا کر علم کی پیاس بجھائی: مثلاً سردار یوسف خان،[۱۷] چیف آف جھالاوان گوہر خان کا لخت جگر تھا۔جسے ۱۸۹۰ء میں بارہ سال کی عمر میں سر رابرٹ سنڈیمن نے ایم اے او کالج علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔وہ علی گڑھ اسکول اور بعد ازاں کالج کا طالب علم تھا۔اسے تعلیمی ترقی کا نہایت شوق تھا اور وہ تعلیمی میدان میں سربرآوردہ ہونے کے علاوہ کھیلوں (فٹ بال اور کرکٹ) میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔وہ علی گڑھ کالج کی پہلی کرکٹ ٹیم کا رکن بھی تھا۔اس کی مسند نشینی بھی ہوئی تھی۔۱۸۶۹ء میں اسے اپنے وطن میں قتل کر دیا گیا۔سردار یوسف خان بلوچستانی کی ناگہانی موت پر پرنسپل کالج مسٹر تھیوڈر بیک (مختصر نام ٹی۔بی) نے انگریزی میں نظم لکھی اور مولوی محمد داؤد نے مرثیہ کہا۔

بلوچستان کے مایۂ ناز مؤرخ اور دانشور محمد[۱۸] سردار خاں گشکوری بلوچ بمقام مل (سبی) پیدا ہوئے۔۱۹۳۱ء میں سنڈیمن ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ایف سی کالج لاہور میں ایف ایس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



سی (نان میڈیکل) میں داخلہ لیا، لیکن فٹ بال کی ٹیم کے کپتان بن گئے اور اسی میں زیادہ دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ بعد میں علی گڑھ چلے گئے اور محنت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ وہاں سے ۱۹۳۸ء میں ایم۔اے، ایل ایل بی پاس کر کے لوٹے۔ عالمی شہرت کے مالک پروفیسر ڈاکٹر ہادی حسن نے اپنے سرٹیفکیٹ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۳۸ء میں لکھا ہے کہ ''آپ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۸ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طالب علم رہے۔ آپ وقت کے پابند اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ میں نے پندرہ سال میں ان سے زیادہ باعزم اور موثر کردار والا طالب علم نہیں دیکھا۔ یہ بنیادی طور پر ایک رہنما ہیں۔ جس میں پیش پیش رہنے، دلیری کا مظاہرہ کرنے اور صاف و شفاف سوچ رکھنے جیسی خوبیاں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بلوچستان میں ایک نام پیدا کریں گے''۔

آپ ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۲ء سابقہ ریاست قلات کے وزیر تعلیم رہے۔ پھر علی گڑھ پہنچے اور ''لائف اینڈ ورکس آف احمد شاہ ابدالی'' پر تحقیق کرتے رہے۔ جنگ کے باعث لندن سے کتابوں کے عکس وغیرہ نہ مل سکے اس لیے یہ تحقیق پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ آپ ایک عرصہ تک ''بلوچی اکیڈیمی'' کوئٹہ کے چیئرمین رہے۔

آپ کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جیسے

۱۔ **ہسٹری آف بلوچ ریس اینڈ بلوچستان**، کراچی، ۱۹۵۸ء ۲۹۲ صفحات اس کا اردو ترجمہ بعنوان بلوچ قوم کی تاریخ از پروفیسر ایم۔ انور رومان چھپا ہے: حصہ اول: لاہور، ۱۹۸۰ء ۲۸۷ صفحات اور حصہ دوم: لاہور، ۱۹۸۰ء ۳۲۰ صفحات، کل صفحات ۶۰۷

۲۔ **دی گریٹ بلوچ**، کراچی، ۱۹۶۷ء، ۲۶۵ صفحات، اس کا اردو ترجمہ بعنوان چاکر اعظم از عبدالغفار ندیم شائع ہوا ہے: لاہور، ۱۹۸۸ء ۲۲۷ صفحات۔

۳۔ **پلنگ و بلوچ** (بلوچی بہادروں کا تذکرہ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف داد شجاعت دی) کوئٹہ، ۱۹۶۶ء ۱۸۰ صفحات۔

۴۔ *اے لٹریری ہسٹری آف دی بلوچیز*، جلد اول، کوئٹہ، ۱۹۷۷ء ۵۳۵ صفحات۔

۵۔ *لٹریری ہسٹری آف دی بلوچیز*، جلد دوم، کوئٹہ، ۱۹۸۴ء ۵۳۴ صفحات۔

محترم شاہین روحی بخاری نے ''عقاب بلوچستان'' (سوانح عمری محمد سردار خاں گشکوری بلوچ، کوئٹہ، ۱۹۸۶ء ص ۱۷۶) میں لکھا ہے جناب محمد سردار خان بلوچ کی قائداعظم سے ۱۹۴۳ء میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ملاقات ہوئی تھی ۔ قائداعظم نے فرمایا کہ '' کیا بلوچ قوم ہماری جدوجہد میں حصہ نہیں لے گی'' سردار صاحب نے کہا کہ ایک چیز ہم میں مشترک ہے اور وہ ہے اسلام ۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے بلوچ قوم آپ کے لیے اور پاکستان کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہے ۔ اور اگر خدانخواستہ پاکستان نہ بنا تو اس صورت میں بلوچستان ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک اڈہ (Jumping یا Standing place) بنے گا اور یہاں سے مسلمانوں کی آزادی کے لیے ہم جدوجہد اور جنگ شروع کریں گے ۔ بہر کیف ہم اپنے ہندوستان بھر کے مسلمان بھائیوں کے شانہ بشانہ جنگ آزادی میں ضرور حصہ لیں گے ۔'' قائداعظم بہت خوش ہوئے ۔ مولانا ممتاز علی [19] (جن کا ذکر پہلے آچکا) کے ایما پر پنڈی کے لودھی خاندان جو کوئٹہ میں آباد ہو چکا تھا، کے کریم بخش لودھی علی گڑھ گئے ۔ تعلیم کے حصول کے بعد وہیں ملازم ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے پروفیسر معاشیات بنے ۔ (ڈاکٹر ایل ۔ کے ۔ حیدر)

سابق صوبائی وزیر سرور خاں کاکڑ (برشور) کے عزیز محمد اکبر خاں خلف مولوی بدرالدین بھی مولانا ممتاز علی کے مشورہ پر علی گڑھ بھیجے گئے ۔ آپ ایم ۔ اے، ایل ۔ ایل ۔ بی کر کے آئے اور مختلف عہدوں پر تعینات رہ کر وکالت کو بطور پیشہ اپنایا ۔ مولانا ممتاز علی کے پوتے مولوی محمود احمد ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۰ء علی گڑھ میں زیر تعلیم رہے ۔ بعد میں بلوچستان آ کر کئی عہدوں پر تعینات رہ کر بحیثیت ڈپٹی کمشنر ریٹائر ہوئے ۔ آپ اکثر اخبارات میں اپنے جدید و قدیم تاثرات لکھتے رہتے ہیں ۔ '' مسز اے ایچ داؤد کی یادداشتیں اور پروفیسر ڈاکٹر حسن اشفاق صدیقی کا مضمون 'علی گڑھ کے یادگار لمحات' '' (قائداعظم، علی گڑھ تحریک اور بلوچستان' ڈاکٹر انعام الحق کوثر، کوئٹہ، ۲۰۰۱ء، ص ۴۱ تا ۴۹ میں شائع ہوئے ہیں) ۔ ملک صالح محمد خان لہڑی ایم ۔ اے، ایل ۔ ایل ۔ بی (علیگ) نے ایک کتاب ''بلوچستان'' (ون یونٹ سے پہلے) تحریر کی تھی ۔ کوئٹہ، ۱۹۵۵ء ۳۰۳ صفحات ۔

متذکرہ بالا صاحبان کے علاوہ سردار رشید جان، میر غوث بخش بزنجو، میر محمد فاضل محمد شہی، سردار انور جان کیتھران، محمد شاہ خان ترین، شاہ محمد ترین، گل محمد خان، میر علی دوست بگٹی، رحیم بخش، شیر علی خاں (مالک راحت سینما کوئٹہ، لورالائی کے باسی، ہمیشہ شیروانی پہنتے تھے) محمد حسن بلوچ (سابق وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی) ملک عطا محمد، فقیر محمد بلوچ (سابق چیف سیکرٹری بلوچستان) اور میر غلام محمد شاہدانی نے علی گڑھ تعلیم پائی ۔

پروفیسر محمد وسیم عباسی (ایم ۔ اے انگلش، علیگ، آمد کوئٹہ جون ۱۹۴۵ء) اور مولوی محمود احمد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



(ریٹائرڈ ڈی۔سی) نے ایک سروے رپورٹ تیار کی تھی جس کی رو سے بلوچستان میں قیام پاکستان سے پیشتر ستر پچھتر علیگیرین مختلف محکموں میں مختلف عہدوں پر خدمات انجام دے رہے تھے۔جن میں شامل ہیں، بشیر احمد ہاشمی (سپرنٹنڈنٹ ایجوکیشن) مس امینہ قاضی (ڈپٹی سپریٹنڈنٹ ایجوکیشن) فیض محمد خان (پرنسپل سنڈیمن ہائر سیکنڈری سکول۔انٹر کالج) ملک کرم الٰہی (ایڈووکیٹ) ڈاکٹر این ایم (نور محمد) خان، ڈاکٹر عبدالحئی خاں، ڈاکٹر حئی قدوائی، سید نصیر احمد رضوی (ڈپٹی ڈائریکٹر سروے) عبدالرؤف خاں (وزیر تعلیم، وزیراعظم قلات) محمد وسیم عباسی (لیکچرار انگلش) چودھری فضل محمد، سید عون، ساجد حسن قادری، حافظ انوار الہدیٰ، حافظ نجم الہدیٰ، سرور حسین ایوبی، قیام پاکستان کے بعد آنے والوں میں شامل ہیں: سید ریاض الحسن، محمد مقیم انصاری، پروفیسر سعید احمد رفیق، پروفیسر جمال الدین، پروفیسر کرم الٰہی، (تفصیل دیکھیے: *قائداعظم، علی گڑھ تحریک اور بلوچستان*، پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر، کوئٹہ ۲۰۰۱ء)

۳ جون ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان اور پاکستان کو آزادی دینے کا اصول تسلیم کر لیا، جس سے مسلم لیگ کے حوصلے مزید بلند ہوگئے اور وہ ہر سازش کا جواب دینے کے لیے پوری طرح تیار ہوگئی۔اگرچہ کانگرسی سازشوں اور بے پناہ سرمائے نے صورت حال کو خاصا بگاڑ دیا تھا۔بلوچستان میں ریفرنڈم (استصواب رائے) کی تاریخ ۲۹ جون مقرر ہوئی تھی۔مگر اس سے قبل ہی بعض ایسی مشکلات پیدا ہو چکی تھیں جن کی وجہ سے پاکستان کے حق میں فیصلہ ہونا آسان نظر نہیں آتا تھا۔چنانچہ مسلم لیگی زعماء قبائلی سرداراور سرفروش حالات کا رخ موڑنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔[۲۰]

اسی دوران میں محکمہ اطلاعات بلوچستان کے ہفت روزہ *اخبار بلوچستان* نے بلوچستان کی آمدنی اور اخراجات کے اعداد و شمار شائع کیے، جن سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ بلوچستان مالی اعتبار سے خسارے کا سودا ہے اور مرکزی حکومت کو ہر سال اس علاقے پر کروڑوں روپے خرچ کرنے ہوں گے اور یہ خسارہ ایک بڑی مملکت ہی برداشت کر سکتی ہے۔سرداروں میں یہ اعداد و شمار بڑے اہتمام سے پھیلائے گئے۔ان امور کے ساتھ ساتھ انگریز حکام کی دلچسپیاں بھی صاف طور پر سامنے آرہی تھیں۔ایک انگریز حاکم نے ایک نجی محفل میں کہا تھا:[۲۱] ''ہم نے ساحل مکران سے لے کر فورٹ سنڈیمن کے پہاڑ اور نوشکی سے لے کر نصیر آباد تک ہندو سلطنت کے لیے راستہ ہموار کر دیا ہے''۔

**بلوچستان کی سچی کہانی** میں مذکور ہے:[۲۲] ''سازش کی کڑیاں ایک ایک کر کے ظاہر ہو رہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



تھیں ۔ بلوچستان کا ریفرنڈم پہلے ہونا تھا اور صوبہ سرحد کا بعد میں ۔ انگریزوں کی اسکیم یہ تھی کہ پہلے بلوچستان میں کام کیا جائے کیونکہ ۶۵ ممبروں کو قابو میں کرنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ۔ بلوچستان اگر بھارت میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کا اثر صوبہ سرحد پر بہت گہرا پڑے گا۔ صوبہ سرحد میں کانگریس کی وزارت تھی اور بلوچستان کے فیصلے کے بعد اس کا فیصلہ بھی یقیناً بھارت کے حق میں ہوتا ۔ ان فیصلوں سے ریاستوں کا متاثر ہونا بھی یقینی تھا۔ برٹش بلوچستان اور چار بلوچ ریاستوں کا رقبہ کل مغربی پاکستان کے رقبے سے تقریباً آدھا ہے ۔ اگر خدانخواستہ یہ علاقہ پاکستان کے بجائے بھارت میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیتا تو شائد پاکستان وجود میں نہ آتا ہندو اور انگریز بلوچستان کی اس حیثیت سے پوری طرح باخبر تھے اور وہ سب سے پہلے اسی علاقے میں شب خون مارنے کی پوری تیاریاں کر رہے تھے'' ۔

ہندو اور انگریز ان درون پردہ سازشوں کے علاوہ اعداد و شمار کا حربہ بھی بڑی قوت کے ساتھ استعمال کر رہے تھے ۔ اس نازک موقع پر قدرت نے اہل بلوچستان کی مدد کی اور اتفاق سے مسلمان ماہر مالیات جناب زاہد حسین صاحب کوئٹہ تشریف لے آئے ۔[۲۳] چنانچہ نواب جوگیزئی[۲۴] صاحب سے کہا گیا کہ وہ زاہد حسین صاحب سے درخواست کریں کہ وہ سرداران بلوچستان کے ایک اجتماع میں پاکستان کی معیشت پر گفتگو فرمائیں ۔ اس درخواست کے جواب میں زاہد حسین صاحب نے پاکستان کی مالیات پر بڑی مدلل تقریر کی ، جسے سرداروں نے غور سے سنا ۔ ایک صاحب نے مقرر موصوف سے پوچھا: ''زاہد صاحب، آپ یہ بتائیے کہ کیا پاکستان کا اپنا سکہ ہوگا ؟'' ہاں، ہاں، پاکستان کا اپنا سکہ ہوگا''، زاہد صاحب نے زور دیتے ہوئے کہا۔ اس پر ایک پٹھان سردار اٹھا اور پوری قوت سے چلایا: ''بھائیو، پاکستان کیسے غریب ملک ہوسکتا ہے ۔ حکومت کو جس قدر پیسوں کی ضرورت ہوگی وہ اسی قدر نوٹ چھاپ لے گی'' ۔

اس مجمع میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو ہندوستان کے لیے کام کر رہے تھے ۔ انہوں نے سرداروں کو اس بات میں الجھانا چاہا کہ نوٹ چھاپنے کے لیے سونے اور چاندی کے ذخائر ہونے چاہئیں اور پاکستان کے پاس ذخائر موجود نہیں ہیں ۔ اس پر ایک سردار نے غصے میں کہا: ''آپ جب انگریزوں کا چھاپا ہوا نوٹ لیتے ہیں تو سونے چاندی کے بارے میں کبھی نہیں پوچھتے ، آخر پاکستان کے بارے میں آپ لوگوں کو اس قدر تردد کیوں ہے؟'' اس نوک جھونک سے کانگریسی عنصر شکست کھا گیا اور انگریزوں کی سازش بڑی حد تک ناکام ہوگئی ۔[۲۵]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اس پس منظر میں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کوئٹہ نے جس کے صدر جناب مقبول الرحیم تھے، ایک پمفلٹ [۲۶] بعنوان *پاکستان اور اقتصادیات بلوچستان* (کل صفحات: ۱۲) ۱۷ جون ۱۹۴۷ء کو چھاپ کر وسیع پیمانے پر تقسیم کیا۔ اس کتابچے کے تعارف میں تحریر کیا گیا ہے کہ اس کی سرپرستی جناب زاہد حسین نے فرمائی۔ جن کا شمار ان بلند پایہ ماہرین مالیات و اقتصادیات میں ہوتا تھا جن پر مسلمانان عالم بالعموم اور مسلمانان پاکستان بالخصوص بجا طور پر فخر کرتے تھے۔ اس کتابچے کی زبان سادہ اور عام فہم ہے اور درپیش مسئلے یعنی بلوچستان مالی اعتبار سے خسارے کا سودا ہے اور مرکزی حکومت کو ہر سال اس علاقے پر کروڑوں روپے خرچ کرنے ہوں گے اور یہ خسارہ ایک بڑی مملکت ہی برداشت کر سکتی ہے (حوالہ ہفت روزہ **اخبار بلوچستان** شائع کردہ محکمہ اطلاعات بلوچستان) پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان مقاصد کو بھی واضح کیا گیا ہے جن کی خاطر پاکستان ناگزیر تھا۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کتابچہ کے ذریعے دشمن کے خوفناک عزائم کی نقاب کشائی کی گئی اور بلوچستان کے مسلمانوں کو بروقت صحیح صورت حال سے آگاہ کر کے ایک ناقابل فراموش خدمت انجام دی گئی۔ (اس مقالہ کے آخر میں کتابچہ شامل کر دیا گیا ہے جس کی تاریخی اہمیت سے انکار ممکن نہیں)

قائداعظم کو پوسٹ آفس سپرنٹنڈنٹ ابراہیم علی خان کے توسط سے جنہوں نے تشکیل پاکستان میں خاموشی کے ساتھ اہم کردار ادا کیا ان حالات سے آگاہ کیا گیا۔ چنانچہ قائداعظم نے اس سلسلے میں ۲۵ جون ۱۹۴۷ء کو مندرجہ ذیل بیان جاری کیا:

> اب فیصلہ ہو چکا ہے کہ بلوچستان میں ۲۹ جون کو استصواب رائے ہوگا۔ میں ہر مسلمان سے اپیل کرتا ہوں کہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کی بجائے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونے کے حق میں ووٹ دیں۔ مجھے امید ہے کہ رائے دہندگان جو شاہی جرگہ کے ارکان (ماسوائے نمائندگان ریاست قلات) اور کوئٹہ میونسپل کمیٹی کے غیر سرکاری نمائندوں پر مشتمل ہیں اپنا فیصلہ دیتے وقت اس چیز کا احساس کریں گے کہ بلوچستان مملکت پاکستان میں ہی باعزت طور پر زندہ رہ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں سیاسی، جغرافیائی اور اقتصادی نقطہ نگاہ سے بھی بلوچستانی عوام کا مفاد اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ پاکستانی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہوں کیونکہ ان کی تعلیمی، سماجی، اقتصادی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



سیاسی ترقی کے لیے صرف پاکستان ہی بلوچستان کا مددو معاون ثابت ہوسکتا ہے۔
میں بلوچستان کے عوام کو یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان میں تمام طبقوں اور مفادات سے انصاف ہوگا اور مجھے امید ہے کہ ہمارے دشمنوں نے جو گمراہ کن پراپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے اور جس کے مطابق وہ ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ کے خلاف اور ایک مفاد کو دوسرے مفاد کے خلاف صف آراء کر رہے ہیں وہ بلوچستان میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکے گا۔
مسلمانوں کی نجات ان کے اتحاد و یک جہتی اور تنظیم کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ اس کے علاوہ اس لیڈر کی ذات پر اعتماد بھی ضروری ہے جو گزشتہ دس سالوں سے آپ کی خدمت کر رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ متفقہ طور پر پاکستانی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونے کے حق میں رائے دیں گے۔[۲۷]

قائداعظم کے اس بیان کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ چنانچہ باہمی تبادلہ خیال کے بعد نواب محمد خان جوگیزئی اور میر جعفر خان جمالی نے پاکستان کی حمایت میں مشترکہ بیان جاری کیا۔[۲۸] ۲۹ جون ۱۹۴۷ء کو شاہی جرگہ کے ممبران اور میونسپل کمیٹی کے منتخب ممبران (حاضر تعداد ۵۴) نے پاکستان کے حق میں متفقہ فیصلہ کیا۔ اس متفقہ فیصلہ پر قائداعظم نے کہا تھا ''ویل ڈن بلوچستان'' جسے *انجام* دہلی نے چھ کالمی سرخی ''شاباش بلوچستان'' کے ساتھ شائع کیا تھا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: *جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار*، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، لاہور، ۱۹۹۱ء، ۱۹۹۴ء، ص ۲۹۱ تا ۳۱۲)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی برصغیر کی واحد درس گاہ تھی جہاں درہ خیبر سے لے کر آسام کے آخری گوشے اور ہمالیہ کی ترائی سے راس کماری تک کے ہر علاقے اور ہر حصہ سے مسلم طلبہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے اور اسلامی ثقافت اور فکر و عمل کے سانچے میں ڈھل جاتے تھے۔ جو تحریک یہاں سے اٹھتی تھی ان طلبہ کے ذریعے ملک کے طول و عرض میں پھیل جاتی۔ اس لیے تحریک پاکستان میں بھی قائداعظم کی ہدایت پر یہاں کا ہر طالب علم ملت کا پرجوش سپاہی بن گیا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں ہوتا یا شہر اور بازاروں میں یا رخصت گزارنے اپنے وطن جاتا قائداعظم کے پیغام اور نظریہ پاکستان کی تشہیر ہر جگہ اور ہر حال میں اس کے پیش نظر ہوتی۔[۲۹] قائداعظم ان نوجوانوں کو اپنا سفیر کہتے تھے۔ وہ ان کے مشنری جذبے اور تحریک پاکستان سے بے لوث لگاؤ کو اپنی ساری متاع قرار دیتے تھے۔ وہ ان کی امداد کو اپنے لیے پیام امید سمجھتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



۱۹۴۵ء کے انتخابات برصغیر کے مسلمانوں کی ملی تاریخ کا اہم ترین موڑ تھا۔ قائداعظم کے اس پیغام نے کہ انتخابات میں ہماری مدد کرو طلبہ کے احساسات میں ایسی آگ لگا دی جس نے ہندو سامراج اور انگریزی استعمار دونوں کو جلا کر رکھ دیا۔ علی گڑھ سے دو ہزار سے زائد طلبہ نے اپنی تعلیم کو خیر باد کہا اور سروں سے کفن باندھ کر قائداعظم کا پیغام پہنچانے کے لیے سندھ کے ریگستانوں میں اور صوبہ سرحد کے سنگلاخ علاقوں میں کہیں اونٹوں اور کہیں پیدل ہزاروں میل کا سفر کر کے قریہ قریہ اور شہر شہر پہنچ کر دور افتادہ مسلمانوں کو قائداعظم کے پیغام اور مطالب پاکستان سے روشناس کیا۔ کتنے کتنے دن صرف چند کھجوروں پر اکتفا کیا۔ [۳۰]

ان انتخابات میں بلوچستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے متعدد دستوں نے ہندوستان بھر میں پہنچ کر مسلم لیگ کے لیے کام کیا۔ شہید ملت لیاقت علی خاں بلوچستان کے طلبہ کے اس کام سے بہت خوش ہوئے اور انہوں اس کی ستائش ان الفاظ میں کی: ''آپ نے ثابت کر دکھایا کہ بلوچستان سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے دیگر صوبوں سے کمتر نہیں، جایئے، خدا حافظ اور اپنے صوبے میں کام کیجیے۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے''۔ [۳۱]

۱۵ فروری ۱۹۴۸ء کو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن بلوچستان کے اراکین (حاجی محمد اعظم خان، مسعود غزنوی، سلیم جہانگیر، محمد رفیق پراچہ، عبدالرؤف، صالح محمد خان مندوخیل، محمد اکبر، عبدالخالق کاسی) نے سبی میں قائداعظم سے ملاقات کی۔ پہلے ملاقات کا پروگرام طے نہ تھا۔ قائداعظم نے روایتی انداز کو ختم کرتے ہوئے طلباء سے ملاقات کا وقت نکالا جس سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ انہیں طلباء سے کتنا گہرا لگاؤ تھا۔

پروفیسر انور رومان (مشرق، کوئٹہ ۲۲ ستمبر، ۱۹۸۳ء) نے لکھا ہے کہ قائداعظم نہایت خندہ پیشانی سے ان نوجوانوں کو تعمیر کردار، شبانہ روز محنت، جذبہ ایثار، اصلاح معاشرہ، خدمت خلق اور نظم و ضبط پر ابھارتے ہوئے ان کڑے اور کٹھن مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جنہوں نے فوری طور پر ملک کو گھیر لیا تھا، انہیں مستقبل کے غیاب وحضور سے آگاہ کرتے رہے۔ وفد کے ارکان اپنی جگہ یہ سوچتے رہے کہ قائداعظم بن کہے ان کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے اور بن بتائے ان کے منصوبوں پر تبصرہ کر رہے تھے۔ [۳۲]

۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کے منظور ہونے کے ساتھ ہی قائداعظم محمد علی جناح نے وکالت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ترک کر دی اور اپنے آپ کو کلیتًا مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔دوران وکالت (۱۸۹۷ء۔۱۹۴۰ء) انھوں نے دو کروڑ روپے کمائے تھے اور انہی پر آخر تک نہایت کفایت شعاری سے بسر اوقات کرتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ قوم کے لیے بھی خرچ کرتے رہے اور جو کچھ نقد یا بصورت جائیداد بچ رہا تھا وہ وصیت کے مطابق علی گڑھ یونیورسٹی، سندھ مدرستہ الاسلام اور اسلامیہ کالج پشاور میں برابر برابر تقسیم کر دیا۔حکومت پاکستان سے انہوں نے کچھ نہیں لیا اور سرکاری اخراجات بے حد کم رکھے۔یہ تھا ان کا بے مثال اور ناقابل فراموش کردار۔وہ ایک غیر معمولی قوت کار، قوت ارادی، اور مومنانہ فراست سے متصف تھے۔وہ مومنانہ فراست سے بر وقت کام لینے کا سلیقہ بھی خوب رکھتے تھے۔انہوں نے مسلم قوم کو ایمان، اتحاد اور تنظیم سے بہرہ ور کیا۔[۳۴]

قائداعظم اور علی گڑھ تحریک سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ انہیں علی گڑھ سے کتنا گہرا لگاؤ تھا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا دل و جان سے ان کے شیدائی اور فدائی تھے۔اس سلسلے میں راقم الحروف کی کتاب *قائداعظم، علی گڑھ تحریک اور بلوچستان* (کوئٹہ، ۲۰۰۱ء) ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

علی گڑھ تحریک نے برصغیر کے مسلمانوں پر ان مٹ اور دیرپا نقوش چھوڑے۔نتیجتًا مسلمانوں نے اپنی مدد آپ کے تحت مختلف مقامات پر تعلیمی ادارے قائم کیے جو مسلمانوں کی پیشرفت کا باعث بنے۔سرسید کی سوچ اور عمل کتنا ہمہ گیر اثر رکھتا تھا کہ بلوچستان بھی اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔قائداعظم بلوچستان کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے۔موجودہ مقالے میں قائداعظم، علی گڑھ تحریک اور بلوچستان کے باہمی اثرات صاف وشفاف انداز میں صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوئے ہیں۔

## حوالہ جات


۱۔ پروفیسر انور رومان، *یوسف عزیز مگسی*، سالنامہ بولان، کوئٹہ، ۱۹۵۵ء

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر، (*تحریک پاکستان اور صحافت*، کوئٹہ، ۱۹۹۷ء)، ص ۶

۳۔ ایضاً *تحریک پاکستان بلوچستان میں*، (لاہور، ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۸ء)، ص ۱۱، ۱۷

۴۔ ایضاً، *بلوچستان میں اردو*، لاہور، (راولپنڈی، ۱۹۸۶ء، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۰۹

۵۔ میر محمد امین کھوسا اپنے مضمون *بلوچستان کے اولین انقلابی رہنما* (نصرت، کراچی۔عزیز مگسی نمبر ۵ جون ۱۹۵۷ء) میں لکھتے ہیں: ''شکوہ اور جواب شکوہ اور اقبال کی دیگر نظمیں اس جوان سردار کی سیاسی راہنما بنیں اور آناً فاناً یہ نازونعم میں پالا ہوا نواب زادہ اپنی قوم میں سے جہالت اور مفلسی دور کرنے


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کے خیال سے بلوچستان کے استبدادی حلقہ پر یلغار کرتا ہے''۔

۶۔ نوائے وطن، کوئٹہ، (سالنامہ وعزیز نمبر)۱۶جون۱۹۵۵ء

۷۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر، بلوچستان میں اردو، (لاہور،۱۹۶۸ء، راولپنڈی۱۹۸۶ء)، ۱۹۹۴ء، ص۱۲۰

۸۔ ایضاً، مکاتیب یوسف عزیز مگسی، لاہور، ۱۹۷۸ء

۹۔ اختر علی خاں بلوچ، بلوچستان کی نامور شخصیات، جلد دوم، (کراچی، ۱۹۹۵ء)، ص۵؛ مرید حسین خاں مگسی، جغرافیۂ علاقۂ مگسی، (لاہور، ۱۹۳۹ء)، ص۲۴، ۲۵؛ ینگ بلوچستان، کراچی، ۲۰ اکتوبر، ۱۹۳۴ء؛ زمیندار، لاہور، ۲۲ اپریل، ۱۹۳۴ء؛ میزان کوئٹہ، یکم جون، ۱۹۵۱ء؛ بلوچستان میں ارووار ڈاکٹر انعام الحق کوثر، تبصرہ، مشرق، لاہور، ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء؛ ہفتہ وار تنظیم، کوئٹہ، ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء، نظام، کراچی، ۲۰ مارچ، ۱۹۴۷ء؛ یوسف عزیز کے اردو اور فارسی کلام کے مزید نمونے راقم الحروف (انعام الحق کوثر) کی تین کتابوں بلوچستان میں فارسی شاعری، (کوئٹہ۱۹۶۸ء)، بلوچستان میں اردو، (لاہور، ۱۹۶۸ء) اور شعر فارسی در بلوچستان، (لاہور، ۱۹۷۵ء)، میں ملاحظہ فرمائیے

۱۰۔ پروفیسر انور رومان، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند براہوئی، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص۴۰۷ تا ۴۱۱؛ ڈاکٹر انعام الحق کوثر، تذکرہ صوفیائے بلوچستان، لاہور، ۱۹۷۶ء، ۱۹۸۶ء، ۱۹۹۵ء ص۲۳۲ تا ۲۴۴؛ ایضاً، نبی کریم کا ذکر مبارک بلوچستان میں، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص۴۹ تا ۸۷، ایضاً، سرور کونین کی مہک بلوچستان میں، کوئٹہ، ۱۹۹۷ء، ص۳۵ تا ۶۲

۱۱۔ چھوٹا علی گڑھ، اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ، ۱۹۸۴ء

۱۲۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر، جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار، لاہور، ۱۹۹۱ء، ۱۹۹۴ء، ص۴۸

۱۳۔ ایضاً، ص۲۱۴

۱۴۔ ایضاً، ص۲۰

۱۵۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر تحریک پاکستان میں بلوچستان کا حصہ، (راولپنڈی، ۱۹۷۷ء)، ص۲۵

۱۶۔ ایضاً، بلوچستان میں اردو، (راولپنڈی، ۱۹۹۴ء)، ص۹۱

۱۷۔ شرافت عباس، پہلا علیگ طالب علم، (سرآب، کوئٹہ، اگست ۱۹۷۸ء)، ص۵۶ تا ۶۵، شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید، (لاہور، طبع دوم، اگست ۱۹۷۱ء)، ص۳۷۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



۱۸۔ شاہین روحی بخاری، عقاب بلوچستان، (محمد سردار خان گشکوری بلوچ، سوانح عمری کوئٹہ، ۱۹۸۶ء)، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، بلوچستان میں اردو، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۵۰ تا ۱۵۳

۱۹۔ مولوی محمود احمد ریٹائرڈ ڈی۔سی اور پروفیسر محمد وسیم عباسی سے بالمشافہ گفتگو۔۱۳ تا ۱۶ مارچ ۱۹۹۸ء

۲۰۔ مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کیجیے ڈاکٹر انعام الحق کوثر تحریک پاکستان میں بلوچستان کا حصہ، (راولپنڈی، ۱۹۷۷ء)، ص ۱۰۸ تا ۱۲۸، سید محمد فاروق احمد تحریک پاکستان اور بلوچستان، (کراچی، ۱۹۷۷ء)

۲۱۔ بلوچستان کی سچی کہانی، (بلوچ پنجاب برادرہڈ، لاہور)، ص ۱۲

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۲

۲۳۔ پاسبان، کوئٹہ، ۲۰ جون ۱۹۴۷ء

۲۴۔ بلوچستان کی سچی کہانی، ص ۱۲۔۱۳

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۳

۲۶۔ مقبول الرحیم، پاکستان اور اقتصادیات بلوچستان، کوئٹہ، ۱۹۴۷ء، ص ۱ تا ۱۲

۲۷۔ بلوچستان کی سچی کہانی (پمفلٹ) بلوچ پنجاب برادرہڈ، لاہور، ص ۹

۲۸۔ نوائے وقت، لاہور، ۲۸ جون ۱۹۴۷ء

۲۹۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر، تحریک پاکستان اور صحافت، کوئٹہ، ۱۹۹۷ء، ص ۲۹۳

۳۰۔ ایضاً 'قائد اعظم، علی گڑھ تحریک اور بلوچستان، ایضاً' کوئٹہ ۲۰۰۱ء، ص ۸، ۱۳

۳۱۔ ایضاً 'ہماری جدوجہد، عبدالرحمٰن غور، کوئٹہ، ۱۹۵۴ء، ص ۱۲۸۔۱۳۱، ایضاً 'بلوچستان میں اردو، ایضاً، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۳

۳۲۔ ایضاً 'قائد اعظم اور بلوچستان، ایضاً' کوئٹہ، ۲۰۱ء، ص ۲۰۔۲۱

۳۳۔ ایضاً 'قائد اعظم، علی گڑھ تحریک اور بلوچستان، ایضاً، کوئٹہ، ۲۰۰۱ء، ص ۴

© rasailojaraid.com